رشید امجد: گہرے تہذیبی شعور کا افسانہ نگار

Rasheed Amjad: A Short Story Writer of Deep Cultural Awareness.

ڈاکٹر فرید حسینی
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف چکوال، چکوال
ڈاکٹر تنویر الرحمٰن
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف چکوال، چکوال

Abstract

Rashid amjad is the most significant figure in urdu prose. He is a multi dimential personality i.e critic, scholar, teacher, editor, etc but his most powerful aspect of personality is short story writer. He experienced the subcontinent division and is eye witness of crash of civilization. He has a great sense of civilization which he used in his stories. Though this layer is between the lines but is a real fact that civiliation discussed in its ture spirit. This article is an effort to explore that sense of civilization.

کلیدی الفاظ: سومیری، بابلی، مصری، یونانی، مہابھارت، گل گامش، اوڈیسی

کہانی کی قدامت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل امر ہے۔ معلوم انسانی تاریخ (سومیری، بابلی، مصری، یونانی، ہندوستانی وغیرہ) میں اس کا وجود ملتا ہے۔ جن میں گلِ گامش سے اوڈیسی اور مہابھارت سے جاتک کتھائیں تک ان گنت کہانیاں موجود ہیں۔ آثارِ قدیمہ، جدید علوم میں مثبت اضافہ ہے جس کے ذریعے مدفون تہذیبوں کی بازیافت کی گئی اور یوں نامعلوم تاریخ کا بھی کھوج لگایا گیا۔ اجنتا کے غار، مصری اہرام، بدھ کے سٹوپے، موہن جو داڑو، ہڑپہ اور نجانے کتنے گم شدہ زمانے منصۂ شہود پر آئے۔ ان آثار سے ماہرین و علماء نے قدیم تہذیبوں کے بارے آگاہی دی۔ گزشتہ اقوام کے رسوم و رواج، رہن سہن، قوانین و روایات کا پتہ لگایا تو جہاں بہت سے اور انکشافات ہوئے وہیں یہ بھی عقدہ کھلا کہ وہ لوگ رات کو بیٹھتے تو گپ شپ کے لیے مجلسیں منعقد کرتے گویا تمدن کے آغاز سے داستان کی ابتداء ہوئے۔ عبدالحلیم ندوی نے لکھا: قوموں کی ادبی تاریخ میں

سے پتہ چلتا ہے کہ جب انہوں نے اجتماعی زندگی گزارنی شروع کی اس وقت سے کہانیاں ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گئیں۔"(۱)

تاریخ کا مطالعہ اس امر پر دال ہے کہ تمدن و تہذیب کی بنت میں داستان کا کردار بہت اہم ہے جو تہذیب جتنی ارفع خیالات کی حامل ہوتی تھی اس کے قصے بھی فنی لحاظ سے اتنے ہی پختہ اور دلچسپ ہوتے تھے۔ ادب کو معاشرے سے منہا کر دیا جائے تو اس کا مہذب ہونا مشکوک ہو جائے۔ ادیب اپنے معاشروں اور قوموں کے آئینے ہوا کرتے ہیں۔ شاعر و کہانی کار کے توسل سے کسی بھی زمانے کی شناخت ممکن ہو سکتی ہے۔ مورخ حقائق کو توڑ مروڑ سکتا ہے سیاسی مجبوریاں سچ سے پہلو تہی برت سکتی ہیں مگر ادیب وہی کہتا ہے لکھتا ہے جو دھرتی کا مافی الضمیر ہوتا ہے۔ کسی زبان کی تاریخ ادب اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاسکتی جب تک اس کے افسانے اس میں شامل نہ کیے جائیں۔(۲)

اردو زبان کی تاریخ ادب بھی اسی قول کے مصداق ہے۔ افسانہ کی عمر ایک صدی سے کچھ زائد ہو چلی ہے اس مدت میں بہت سے افسانہ نگار پیدا ہوئے جنہوں نے اردو زبان کو عالمی برادری کی قدیم اور بڑی زبانوں کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ان میں تقسیم ہند کے بعد کے فنکاروں میں وہ معدودے چند ہیں جو تہذیبی شعور سے بہرہ مند ہیں۔ انہی میں ایک نام رشید امجد کا بھی ہے۔

یہ بات کہ ذاتی دکھ یا قومی سانحہ ہی بڑے ادب کی تخلیق کا سبب بنتے ہیں ممکن ہے اس میں کلی صداقت نہ ہو مگر انتظار حسین اور رشید امجد کے فن کو دیکھ کر یہ قول حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ رشید امجد سری نگر کے متمول گھرانے کا چشم و چراغ ہے جو بقول ممتاز مفتی بارہ سالوں کی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا۔ تقسیم کے سانحے سے ان کو براہ راست واسطہ پڑا۔ ان کا خاندان تقسیم ہوا، والدین بلوؤں کی وجہ سے واپس کشمیر نہ جا سکے والد صاحب نے کوئی جھوٹا پراپرٹی کلیم داخل نہ کیا بلکہ محنت مزدوری کی اور تلخ اوقات سے ہی دوچار رہے۔ تقسیم کے وقت رشید امجد کی عمر سات سال کے لگ بھگ تھی۔ کسی سانحے، المیے اور حادثے کے لیے یہ عمر بڑی نازک ہوتی ہے۔ بچہ سہم کر اور سمٹ کر ماں کی آغوش میں پناہ لیتا ہے مگر والدین و اقرباء کی بے بسی و بے بساعتی کو اپنے اندر کے خوف اور وسوسوں کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ بس یہی کچھ رشید امجد کے ساتھ بھی بیتا۔ ان کا لڑکپن اتنے بڑے تہذیبی بحران کو بھلا کیسے سہار سکتا تھا۔ ان کی غم و اندوہ ناکی کو افسانوی پیرایہ اگر میسر نہ آتا تو شاید ہمیں ان کی شخصیت میں سے دھرتی کا وہ آفاقی تصور ڈھونڈنے میں کامیابی نہ ملتی جو ان کے فن کی بنیادی پہچان ہے۔ رشید امجد نے جبر کے زمانے میں افسانے میں علامت اور تجرید کے ذریعے اظہار کو ممکن بنایا گو اس سے قبل ان کے سامنے چند مثالیں موجود تھیں۔": رشید امجد افسانہ نگاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے

انتظار حسین اور انور سجاد کے بعد اردو میں علامتی اور تجریدی افسانے کو رائج کرنے میں نمایاں کردار کیا ہے۔" (۳)

خدا تک پہنچنے کے لیے جیسے خود آگاہی ضروری ہے ایسے ہی رشید امجد کا مسئلہ بھی اپنی ذات کا شعور و آگاہی ہے اور اسی واسطے سے وہ دھرتی ماں کو کھوجنے اور پہچاننے کی سعی کرتے ہیں۔ مذہب میں تشکیک کفر اور ادب میں معراج ہے۔ رشید امجد کے ہاں ہر جگہ کیا، کیوں اور کیسے سے سابقہ پڑتا ہے ان کے فن میں ہمیں سوال اور اس سوال میں ضمنی سوالوں کے پہلو ملتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے کہا تھا:

"یہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ رشید کا افسانہ یہ سوال اٹھاتا ہے؟ اس کے افسانوں میں زندگی کی پراسراریت کا عنصر موجود ہے۔"(۴)

شناخت چھن جانے کے نوحے ہر زبان کے ادب میں موجود ہیں اور اردو ادب کو تو شاید بچپن سے ہی حزنیہ صورتحال سے گزرنا پڑا ہے۔ نادر شاہی حملے، غدر اور تقسیم تو ایسے جان لیوا حملے تھے کہ صدیوں کی قدیم روایات ریت کا گھروندا ثابت ہوئیں۔ ان سانحات نے جہاں شرفا کو ذلیل اور رذیلوں کو مسندِ اقتدار بخشے وہیں عام عوام سے ان کی شناخت اور خواب بھی چھین لیے۔ سوال کرنا تو در کنار سوچنا بھی جرم ٹھہرا۔ رشید کے افسانوں میں دھرتی اور ماں دونوں یکساں معانی کے ساتھ آئے ہیں۔ دھرتی چھن جائے یا ماں اس سے بچے دربدر ہو جاتے ہیں اور رشید نے یہ جرات کی کہ اس کے ذمہ داروں سے یہ سوال کیا کہ ایسا کیوں کیا؟ "میری ماں --- میری دھرتی --- میں بڑبڑاتا ہوں۔ میرا ساتھی حیرت سے دیکھتا ہے پھر کہتا ہے --- آپکی ماں بیمار ہیں؟ (سمندر قطرہ سمندر) اس دھرتی کی یادیں جس میں نفاق کی بجائے پیار کے موسم لہلاتے تھے وہ بام و در جن سے حسین یادیں وابستہ ہیں بس وہی یادیں رشید امجد کے پاؤں کی زنجیریں ہیں۔

"یادیں اپنے پاؤں میں گھنگروں باندھتی ہیں اور میرے وجود کے اجڑے کھنڈر میں چھن چھنا چھن ناچنے لگتی ہیں --- (یاہو کی نئی تعبیر)

رشید امجد جن جڑوں کو تلاش کرنے نکلے ہیں وہ دار شکوہ کے ویدانتی مسلک میں پیوست ہیں تقسیم در اصل دارا کی شکست کی آخری Episode ہے۔ اورنگ زیب کی فتح دراصل اکبر کی شکست ہے۔

> "قاضی عبد الستار نے دارا شکوہ (۱۹۶۷ء) میں دارا شکوہ کے مسلک ویدانت کے حوالے سے ہندی مسلمانوں کی جڑوں کی سرزمین ہند سے وابستہ قرار دیا۔ لیکن اس مسلک پر اورنگزیب کے راسخ العقیدہ مذہب نے فتح پائی تھی۔ دارا شکوہ ہی نہیں اکبر اعظم ہار گئے تھے اور مجدد الف ثانی جیت گئے۔"(۵)

ادیب در اصل ہارے ہوئے لشکر کے سپاہی ہیں۔ جنہوں نے شکست تسلیم نہیں کی۔ اپنے زورِ قلم سے فکر و تخیل کے در پہ دستک دیے جا رہے ہیں اور آس لگائے بیٹھے ہیں کہ رنگ لائے گی یہ محنت ایک دن جب تاریخی مغالطے کو کم سے کم مغالطہ تو کہا جائے گا۔

وہ تاریخی مغالطہ جس میں ہیر و اور ولن کو ایسے گڈ مڈ کیا گیا کہ خرد جنون ٹھہرا۔ رشید امجد کے فن میں اپنی ذات سے آگاہی کا پیغام ہے۔ ذات کی پہچان سے دھرتی سمجھ آ جائے گی۔ اور دھرتی ماضی سے رشتہ جوڑنے سے شعور کا حصہ بنے گی۔ ماضی کی تفہیم اگر درست ہو جائے تو حال کو بہتر اور مستقبل کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ وہ خود برن ہال کی راہداریاں، ڈل جھیل، بادام کے باغ، نواں بازار شاہ محلہ (سرینگر) آج بھی یاد کرتے ہیں۔

جہاں نال گڑھی ہو وہاں سے رشتہ توڑنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں جیسا یار لوگوں نے سوچا تھا۔ مکان کے بدلے مکان الاٹ ہو گئے تو جیسے مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ پیڑ، وہ جنگل وہ گلیاں، وہ کوچے وہ آباء کی قبریں وہ رستے۔۔۔ ان کو کون سر پر اٹھا کر منتقل کر سکتا ہے۔ غیر منقولہ تو در کنار یہاں منقولہ جائداد بھی نقل مکانی نہ کر سکی۔ یہی وہ تہذیبی شعور ہے جو رشید امجد کو اپنے ہم عصروں سے منفرد بناتا ہے۔ ان کے افسانوں میں بظاہر بے جان اور مادی اشیاء تک کرداروں کی صورت نظر آتے ہیں:

"میرے بعض کردار ایسے بھی ہیں جو اگرچہ انسانی وجود نہیں رکھتے لیکن میرے ساتھ ان کا برتاؤ انسانوں جیسا ہے۔ میرا گھر، میری گاڑی، سڑکیں، دیواریں اور گلیاں میرے کردار ہیں۔ نانک پورہ میں، میں جس گھر میں رہتا تھا اس کی ایک ایک اینٹ سے میرا مکالمہ ہوتا ہے۔" (میں اور میرے کردار)

میں سڑک کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں تمہیں معلوم ہے ہمیں کہاں جانا ہے؟ وہ نفی میں سر ہلاتی ہے (الف کی موت پر ایک کہانی)

رشید امجد اس رسول ﷺ کے پیروکار ہیں جن کے مکالمے، کھجور کے تنوں، کنکریوں اور جانوروں سے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ وہ وہی فطرت شناس دل رکھتے ہیں جس سے سکوتِ لالہ و گل سے کلام ممکن ہوتا ہے تو پھر کیونکر تہذیب کا ہر جز ان سے ہم کلام نہ ہو۔ اور خود قران مقدس نے گواہی دی کہ بے شک پتھروں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ یہ وہی نظریہ ہے جس کو سب سے پہلے ابن مسکویہ نے پیش کیا اور جسے مولانا روم نے شرح و بسط کے ساتھ عقل کے چار مدارج (ارتقائے کائنات) میں بیان کیا۔

اس نظریے میں عام لوگوں کو بے جان نظر آنے والی چیزیں در اصل زندہ و جاوید ہیں:

"بادہ و خاک آب و آتش بندہ اند۔۔ با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

(ترجمہ۔۔ ہوا، مٹی، پانی اور آگ سب خدا کے غلام ہیں۔ یہ ہمارے تمہارے لیے بے جان ہیں۔ مگر خدا کے آگے زندہ ہیں۔" (٦)

رشید امجد اس راز سے واقف ہیں اسی لیے ان کے مکالمے ان مادی اشیا سے ہوتے۔ مٹی سے جڑت فنکار کے خمیر میں شامل ہوتی ہے جیسے پیڑ کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ دھرتی سے وابستگی جس بھی فنکار میں ہو وہ دوسروں سے الگ اور منفرد پہچان رکھتا ہے۔ ناصر، مجید، منیر، انتظار، وزیر آغا اور رشید امجد اس سلسلے میں پاکستان میں بطور مثال موجود ہیں۔ اس قبیل کے لوگ معاصرین میں شدید تنقید کا بھی سامنا کرتے ہیں اور ناسٹیلجیا اور قنوطیت کے طعنے بھی لیتے ہیں اس کی اور وجوہات کے علاوہ ایک وجہ غالباً قاری وناقد کا خام ادبی شعور بھی ہے۔ یہ حقیت اظہر من الشمس ہے کہ جب بھی شعور میں پختگی آتی ہے ان فنکاروں کی اصلیت اس وقت سامنے آتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔۔ اور مرزا غالب تک سینکڑوں کیس موجود ہیں۔ تہذیبی شعور رکھنے والے ادیب و دانشور اپنی تحریروں کے ذریعے انسانوں کو ماضی سے جوڑے رکھتے ہیں۔ جیسے " الست بربکم " والی صدا پہ " قالو بلا " والا جواب ہمیں یاد نہیں ہے مگر لاشعور میں بہر حال اس کی بازگشت موجود ہے کیونکہ جب کوئی بھی چیز ہمارے وجود کا حصہ رہ چکی ہو زیرِ زمین چلی جاتی ہے تو وہ ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن جاتی ہے۔"(۷)

لاشعور کو شعور میں لانے کا فریضہ بڑا نازک ہے اور خاص طور اس خطے میں جہاں تاریخ کے ساتھ کھلواڑ ہوتا رہا ہو۔ جہاں کے لوگوں سے ان کے خواب و آدرش چھین کر ان کی نسل کی برین واشنگ کا عمل جاری ہو۔ وہاں تو یہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ہاں مگر اس کے لیے فرہاد کی ضرورت ہے رشید امجد ایسا ہی فرہاد ہے جس کے ہاتھ میں قلم کا تیشہ ہے۔ نامساعد حالات میں بھی جو اپنی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ ممتاز مفتی نے ان کی عزم وہمت کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا وہ اس تنقیدی شعور کا پتہ دیتا ہے جو مستقبل میں رشید امجد کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا:

"کشمیری ہاتو کو یہ طاقت عطا ہوئی جو نہ جانے کب سے نامساعد حالات میں مر مر کے جیئے جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ رشید امجد ایک ہاتو ہے۔"(۸)

مسلسل جدوجہد کا Symbol یہ ہاتو Recognition ،اجر اور تعریف سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف ہے۔ تاریخ کے جبر نے تہذیبی ورثے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جس سے عام آدمی کے علاوہ سطحی سوچ کے حامل پڑھے لکھے لوگ بھی کنفیوژن کا شکار ہوئے ہیں۔ مٹھی بھر مفاد پرستوں نے اگر بیرونی حملہ آور کو اپنی دھرتی پر خوش آمدید کہا اور دشمن کی مدد کی (اور ننگِ وطن کہلائے) اسی قماش کے چند مورخ بھی تھے جنھوں نے واقعات کو غلط رنگ میں پیش کیا۔۔۔ مگر زمانے بیت جانے کے بعد تو لازم ہے کہ اس گرد کو جھاڑ دیا جائے اور وہ سچائی کھوجی جائے جو کہیں دفن ہے۔ گزرے زمانے تو واپس نہیں آسکتے مگر اس نسل اور آنے والی نسلوں کو تہذیب کے اس چہرے سے روشناس کروایا جائے جو دانستہ ونادانستہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ تہذیب کی جڑیں کہاں تھیں وہ کونسی تہذیب تھی اصل چہرہ کونسا ہے۔ بتانے کے لیے ضروری ہے کہ

فنکار کے اپنے Concept بہت واضح ہوں وہ کسی تذبذب اور مصلحت کا شکار نہ ہو۔ اسی پہلو کو واضح کرتے ہوئے احمد اعجاز لکھتے ہیں:

"کسی منظر کے پہلو میں ہم اپنی ثقافتی اور تہذیبی جڑوں کی تلاش اور اس میں اپنے تشخص کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں اور کسی منظر کسی پہلو میں ہم اپنی دھرتی کے حقیقی سپوتوں سے اپنی محبت، عقیدت اور وابستگی اور باہر سے آنے والوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے پاتے ہیں کہ اس میں ہمارا تشخص بھی ہے اور ہماری حقیقی پہچان بھی۔۔۔۔ ہے بھگوان۔ پورس اس دھرتی کا سپوت ہے۔ تیرا بیٹا ہے، تیری دھرتی کا رکھوالا ہے، اسے شکتی دیجیو، ہے بھگوان اسے شکتی دیجیو۔۔۔ سکندر کتے میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔ میرا ہیرو پورس ہے۔"(۹)

تقسیم میں جو المیہ سب سے بڑھ کر تھا وہ تہذیب کی جڑوں کے کٹنے کا تھا مگر تاریخ کی گمشدگی نے اس پر غضب ایک اور ڈھایا۔ نظریات کی جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہوگا جبھی تو سکندر یونانی کے نام کے ساتھ اعظم کا لاحقہ لگا کر عوام الناس کو گمراہ کیا گیا۔ اور عوام بھی کیا اچھے اچھے خواص بھی راجہ پورس کو ہندو ہونے کے جرم میں disown کر بیٹھے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ تاریخ نویس بھی جن پر جانبداری کا الزام ہے کم از کم تاریخی سچائی سے اس طرح تو منہ نہ موڑتے تھے کہ اس طرح تو محمد قاسم فرشتہ نے لکھا:

"راجہ بھوج پوار قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے عدل و انصاف اور سخاوت میں ہر طرح سے بکرماجیت کی پوری پوری تقلید کی۔ وہ راتوں کو بھیس بدل بدل کر پھرتا تھا۔ اور ضرورت مندوں اور فقیروں وغیرہ کے حالات سے آگاہ ہو کر ان کی خبر گیری کرتا تھا۔"(۱۰)

بادشاہ کا عادل اور ظالم ہونا مسلمان اور ہندو ہونے سے مشروط نہیں ہے مگر حملہ آوروں کو دھرتی کے سپوتوں پر ترجیح دینا تاریخی و ادبی ظلم ہے اور رشید امجد اس ظلم کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ ان کے افسانے تاریخ کی عدالت میں عام شہری کے وکیل استغاثہ ہیں۔ یہ کیس پچھلے ستر سالوں میں جھوٹے گواہوں اور شاطر مدعیوں کی بدولت معرض التوا میں ہے۔ استغاثہ کی ایک چھوٹی سی ٹیم ہے جس میں ایک وکیل کا نام رشید امجد ہے۔ عدالت میں ثبوت پیش کیے جا رہے ہیں۔ تاریخوں پر تاریخیں بھی پڑتی رہتی ہیں مگر مسلسل جدوجہد کے سمبل اس کیس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔ رشید امجد کی بدولت یہ شعور بھی بیدار ہو چلا ہے کہ ہمیں تہذیب کی جڑیں ہر حال میں تلاش کرنی ہیں۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ بات سکندر تک محدود نہ رہے گی بلکہ غوری اور غزنوی اور ابدالی بھی اس کٹہرے میں آئیں گے اور دھرتی کے سپوت سرخرو ہوں گے۔

-"میں نے سنا ہے بڑے دریا کنارے پورس ان کی راہ تک رہا ہے۔۔۔ (سمندر قطرہ سمندر)

رشید امجد اس راز کو پا چکے ہیں کہ جڑوں کے بغیر وجود کا ثبات ممکن نہیں رہتا چھوٹا سا ہوا کا جھونکا وجود کے لیے خطرے کا باعث بنا رہتا ہے۔۔ اس لیے لازم ہے کہ اپنے وجود کو بر قرار رکھنے کے لیے اپنے تہذیبی تشخص کو زندہ رکھنے کی خاطر جڑوں کی تلاش ضروری ہے۔

"لیکن اپنی جڑوں کی تلاش نہیں بلکہ اپنے ڈولتے وجود کو سہارا دینے کی کوشش ہے۔۔(فتادگی میں ڈولتے قدم)

رشید کے افسانوں میں تہذیبی بو باس اتنی توانا ہے کہ قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے رشید امجد نے حال سے قطع تعلق نہیں کیا بلکہ ماضی کے حوالے سے چند سوال اٹھا کر اپنے آنے والے لوگوں کے مستقبل کے بارے فکر مند ہے۔ حال اور مستقبل کی تکمیل ماضی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

کہانی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ مجھ پر مکمل اکائی کی شکل میں وارد ہوتی ہے ایک خیال سوجھتا ہے جو کہانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ میں کسی واقع سے خیال نہیں نکالتا۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی مخمصے اور اندیشے کا شکار تہذیب کی بابت نہیں ہوتے ان کا نقطہ نظر ٹھوس انداز میں کہانی میں ظہور کرتا ہے جس سے تہذیب کو اس کے اصل روپ میں دیکھنا اور پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔ یہیں سے ان کے گہرے تہذیبی شعور کا پتہ ملتا ہے

وہ ایک حساس دل فنکار ہیں جو قوم کو ان کی ناکامیوں پر آگاہ کرتے ہیں۔ وہ افعال جو نقصان دہ تھے ان سے نفرت کا درس دیتے ہیں۔ خوابوں کے بکھرنے کا نوحہ کر کے آنے والے زمانوں کو مایوسیوں سے بچانا چاہتے ہیں۔ ان کے افسانے حسرتوں اور تمناؤں کے لیے چراغِ راہ کا کام کر رہے ہیں۔

تاریخ کے جبر نے جو چرکے تہذیب کو لگائے ہیں رشید امجد ان سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ ایک پیغام دے رہے ہیں کہ سادہ لوح شہری کا ہر عمل برِ صغیر میں کسی پروپیگنڈے کسی گریٹ گیم کے ماتحت ہے۔ زیاں پر احساسِ زیاں کے جانے کا دکھ رشید کا مسئلہ ہے۔ جنگیں، قبضے سب بجا مگر فکری غلامی اور وہ بھی برین واشنگ کے ذریعے جس میں افراد اپنے آباؤ اجداد کو دشنام اور بیرونی حملہ آوروں کو سلام کرنے پر مجبور ہوئے۔ کیوں؟ یہی سوال ہے جو تہذیب کے ہر شناور نے کیا ہے شمیم حنفی کے بقول:

> "جنگوں میں قتل ہونے والا ہر شخص شہادت کی آرزو نہیں رکھتا نہ بچوں کی کھال کے لیمپ شیڈ اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ ان کا کوئی انفرادی عمل اس سزا کا مستحق تھا۔ یہ جبر معاشرے اور بیرونی دنیا کے اپنے مناقشوں اور مصلحتوں کا ہے۔"(۱۱)

کہانی کا زمین سے رشتہ استوار ہوتا ہے۔ سماج کے بغیر اس کا پنپنا ناممکن ہے۔ دھرتی کے سورما اور ہیرو ہی اس کی پہچان ہوتے ہیں۔ دارا و فریدون ایرانی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے فردوسی کے لیے قابلِ

فخر ہیں۔ برصغیر کے لیے ہیرو بھی دھرتی کے سپوت ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وضع داری اور وسیع القلبی کا ایک واقعہ لکھا ہے (جس کو پیامِ مشرق میں شامل کرنا چاہتے تھے مگر بوجوہ ایسا نہ کر سکے) کہ مہاراجہ کے دربار میں ایک بھانڈ (میراثی) دراز قد کا تھا۔ مہاراجہ کو ایک دن اٹھکیلی سوجھی کہا! تم اونٹ کی طرح لمبے ہو تمھیں جننے میں پتہ نہیں تمہاری ماں نے کتنے دن لگائے ہوں گے اس پر وہ میراثی بولا! حضور کو تو دنیا میں آنے کی اتنی جلدی تھی کہ خدا کو دوسری آنکھ لگانے کی بھی مہلت نہ دی۔ اس جواب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ سمیت سب درباری محظوظ ہوئے۔

رشید امجد اس دھرتی کی مٹی ہیں اور انہیں اس کی ہر چیز سے انس ہے۔ وہ ہمیں کہانیوں کے ذریعے اپنے ہیروز کے بارے آگاہی دیتے ہیں تاکہ ہم اور ہماری نسلیں مایوسی سے بچی رہیں۔ رشید احمد صدیقی کے بقول سورماؤں اور دیوتاؤں کے قصے گاؤں والوں کو بہت عزیز ہوتے ہیں۔ مایوسی اور درماندگی میں اس طرح کی داستانیں ان کے لیے بڑا سہارا بنی رہتی ہیں۔ ہمارے لیے بھی رشید امجد کے افسانے مایوسی سے بچنے کا مجرب نسخہ ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ عبدالحلیم ندوی، ڈاکٹر، عربی ادب کی تاریخ(لاہور، فینس بکس۱۹۸۹ء)ص108

۲۔ صاحبزادہ حمید اللہ، فن اور تکنیک(لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء)ص173-74

۳۔ بشیر سیفی، تنقیدی مطالعے،(لاہور، نذیر سنز،۱۹۹۶ء)ص115

۴۔ ممتاز مفتی، اوکھے اولڑے(لاہور، فیروز سنز،۱۹۹۵ء)ص117

۵۔ ڈاکٹر، محمد عارف، اردو ناول اور آزادی کے تصورات(لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی ۲۰۰۶ء) ص705

۶۔ سید قاسم محمود، پیامِ رومی، فیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص151

۷۔ گوپی چند نارنگ، مابعد جدیدیت،(لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء)ص22

۸۔ ممتاز مفتی، اوکھے اولڑے لوگ(لاہور،، فیروز سنز،۱۹۹۵ء)ص110

۹۔ احمد اعجاز (دیباچہ) رشید امجد کے منتخب افسانے(اسلام آباد، پورب اکادمی،۲۰۰۹ء)ص9

۱۰۔ محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص73

۱۱۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری(لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)ص209